(غلام گردش)

نشست

نوید یزدانی بھی اپنی طرز کا واحد آدمی ہے۔ میڈیکل کالج میں میری ہی کلاس میں تھا۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پانچ سال کیسے گزرے، پتہ ہی نہیں چلا۔ اسکے بعد سی۔ ایس۔ ایس اور پھر ایک قریہ سے دوسرے قریہ۔ زندگی اتنی تیزی سے گزر گئی کہ معلوم ہی نہیں ہوا۔ نوید یزدانی، 1984 کے بعد جیسے گم سا ہو گیا۔ آج سے دس بارہ برس پہلے ملاقات ہوئی تو ایک مختلف انسان تھا۔ پوچھا کہ کس ہسپتال میں کام کر رہے ہو، تو حیران ہو گیا۔ ڈاکٹری چھوڑ چکا ہوں اور پی۔ ایچ۔ ڈی کر لی ہے۔ جواب میرے لیے مکمل طور پر غیر متوقع تھا۔ پھر نوید، اب کیا کرتے ہو۔ بڑے اخلاص سے جواب دیا کہ مقامی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر بہر حال یزدانی سے رابطہ ضرور رہا۔

دو ماہ قبل فون آیا کہ یونیورسٹی میں مینجمنٹ سائنسز کا پروفیسر ہوں۔ طلباء اور طالبات کیلئے ایک نشست رکھی گئی ہے۔ اسکا مقصد ان لوگوں سے طلباء کا سوال و جواب کا سلسلہ ہوگا، جنہوں نے زندگی میں اپنے بنیادی پیشے تبدیل کیے۔ یعنی تعلیمی لحاظ سے کچھ اور بن رہے تھے اور بن کچھ اور گئے۔ پہلا ردِ عمل معذرت کا تھا۔ بنیادی وجہ یہ تھی کہ اپنے زاویہ سے عرض کر سکتا ہوں کہ زندگی میں کچھ نہیں کر پایا۔ درست ہے، میڈیکل کی جاندار لائن چھوڑ کر سرکاری نوکری میں آ گیا اور پھر تقریباً چند برسوں سے لکھنا شروع کر دیا۔ مگر اس میں کسی قسم کا کوئی Achievement شامل نہیں ہے۔ زندگی اتنی ہی خالی اور بنجر ہے، جتنی تیس برس پہلے تھی۔ شائد ذمہ داریاں بڑھ چکی ہیں۔ چاہتے ہوئے بھی یزدانی کو انکار نہ کر سکا۔ تھوڑی دیر بعد، اسکے دفتر سے فون آ گیا۔ تفصیلات بتانے لگے۔ سوال کیا کہ میرے ساتھ دوسرے کون لوگ ہونگے۔ پتہ چلا ڈاکٹر بلال بن خالد اور ڈاکٹر ناصر ہونگے۔ یہ دونوں بھی کے۔ ای میں میرے ہم جماعت تھے۔ دونوں قریبی دوست بھی ہیں۔ ڈاکٹر ناصر سے بہر حال ملاقات کم ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کہ براہِ راست تقریب کی طرف آؤں۔ چند گزارشات کرنا لازم ہیں۔

بلال نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اپنے بڑے بھائی سعد صاحب کے ساتھ ملکر کاروبار کرنا شروع کر دیا۔ آج سے ٹھیک بیس یا پچیس سال پہلے لاہور، جی او آر ون سے متصل سڑک پر پاکستانی ملبوسات کا ایک شاندار شوروم کھولا۔ اسکا نام Zeitgiest ہے۔ مردوں کے کپڑوں کیلئے یہ بہترین مقام تھا اور ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے، تمام بڑے شہروں میں اسکے مزید آؤٹ لیٹ بنتے گئے۔ اسکے پیچھے بلال اور سعد صاحب کی شدید محنت تھی۔ ایک ڈاکٹر کا اتنے معیاری ملبوسات بنانا ایک غیر معمولی بات ہے۔ خیر اس پر بات بعد میں ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر نے میڈیکل کی تعلیم کے بعد سی ایس ایس کیا اور ڈی ایم جی میں آ گیا۔ اسکی طبیعت میں استغناء اتنا ہے کہ تھوڑی سی نوکری کے بعد، پنجاب کے پی اینڈ ڈی پارٹمنٹ کے ایک مخصوص شعبے سے منسلک ہو گیا۔ جسکا نام "اربن یونٹ" تھا۔ ناصر بنیادی طور پر ایک سوشل سائنسدان ہے۔ اس نے ایک بے جان سے ذیلی ادارے کو حکومتی سطح پر تھنک ٹینک بنا ڈالا۔ اسکے ساتھ ساتھ "سالڈ ویسٹ مینجمنٹ" پر بھی بہترین کام کیا۔ آج کی بات نہیں کر رہا۔ ناصر ان شعبوں میں دو دہائیوں سے جُتا ہوا ہے۔ کسی ستائش اور شاباشی کے بغیر۔ خیر اب اپنے کام

میں ایک بھرپور عالم بلکہ اتھارٹی کا درجہ رکھتا ہے۔خاموش سا انسان جو اپنی موجودگی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔

پندرہ دن پہلے، خاکسار اور بلال، لاہور میں نوید کی یونیورسٹی پہنچ گئے جو ہرٹاؤن سے منسلک اس درسگاہ کا نام یو ایم ٹی ہے۔جیسے ہی چند تنگ سڑکوں سے گزر کر یونیورسٹی پہنچتے ہیں تو ایک جہانِ حیرت منتظر ہوتا ہے۔وسیع وعریض کمپلیکس اور شاندار عمارتیں۔یقین ہی نہیں آتا کہ تنگ سڑکیں آپکو کتنی کشادہ علمی درسگاہ میں لے جارہی ہیں۔ڈاکٹر بلال میرے ساتھ تھے۔ہال میں پہنچے تو دوسو سے تین سو طلباء اور طالبات موجود تھے۔سٹیج کے عقب میں ڈاکٹر بلال، ڈاکٹر ناصر اور خاکسار کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔انکے نیچے زندگی میں جو معمولی سے کام کیے ہیں، انکی تفصیلات موجود تھیں۔وہاں پتہ چلا کہ ڈاکٹر ناصر، کسی سرکاری مصروفیت کی بدولت نہیں آسکے۔یعنی اب بلال اور خاکسار نے ان ذہین بچے اور بچیوں کے سوالات کا سامنا کرنا تھا۔سوال وجواب کی نشست میں جتنے زیادہ جواب دینے والے ہوں، اتنی ہی عزت محفوظ رہنے کے امکانات ہوتے ہیں۔کیونکہ آج کی نوجوان نسل بہرحال میری نسل سے تو بہرحال بہت ذہین اور لائق ہے۔نشست کا آغاز ہوا، تو نوید ہی کے ڈیپارٹمنٹ سے منسلک ایک خاتون نے انتہائی شائستگی سے میرا اور ڈاکٹر بلال کا تعارف کروایا۔اسکے بعد باقاعدہ آغاز ہوا۔پہلے ڈاکٹر نوید نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔آغاز طالبعلم سے کیا گیا۔پہلا سوال ہی بہت کٹھن تھا کہ ڈاکٹری پھر سی ایس ایس اور پھر لکھاری۔آخر یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ایمانداری سے عرض کررہا ہوں کہ میرے پاس کوئی ٹھوس جواب نہیں تھا۔بہرحال بات تو کرنی تھی۔کیڈٹ کالج سے کنگ ایڈورڈ کالج کا سفر تو خیر یقینی سا تھا۔مگر مجھے آج تک یاد نہیں کہ میرے والد یا والدہ نے اصرار کیا ہو کہ بیٹا، ڈاکٹر ضرور بننا ہے۔حسن ابدال میں جتنی محنت اساتذہ کرواتے ہیں اسکے بعد کسی بھی میڈیکل کالج میں داخلہ ملنا بڑی معمولی سی بات ہے۔اصل کرشمہ تو ان اساتذہ کا ہے۔جو سکول اور کالج میں آپکو محنت کی عادت ڈال دیتے ہیں۔مشکلات سے گزرنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ہر پل رہنمائی کرتے ہیں۔چنانچہ میڈیکل کالج پہنچا تو اسی محنت کا ایک ردِعمل تھا۔مگر میں بذات خود، میڈیسن کی بھرپور تعلیم حاصل کرتے ہوئے بھی علمی زندگی میں کچھ خالی خالی سا محسوس کرتا تھا۔یا شائد قدرت کسی اور سمت کا تعین کرنا چاہتی تھی۔یقین فرمایئے، کہ میڈیکل کالج کے چوتھے سال ہی مقابلے کا امتحان دینے کا خیال آیا اور پانچ چھ ماہ کی تیاری سے بغیر سوچے سمجھے امتحان دیدیا اور ڈی ایم جی میں آگیا۔کیسے ہوا، کیوں ہوا، کوئی جواب نہیں ہے۔مگر ڈاکٹر نوید کے مشکل سوال کا آخری حصہ کہ کالم باقاعدگی سے لکھنا کیسے شروع کیے۔جواب مکمل بھی بھرپور نہیں تھا۔شائد لکھنے سے اپنی ہی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔بہرحال اب محسوس کرتا ہو کہ میری فطرت لکھنے کے بہت نزدیک ہے۔ڈاکٹر نوید نے میرے سے سوال کرنے کے بعد رخ بلال کی طرف کرلیا۔اندازہ ہوا کہ بلال صرف بہترین کپڑے ہی نہیں بناتا، بلکہ اسلام آباد سٹاک ایکسچینج میں ایک بہت اعلیٰ سٹاک کمپنی کا مالک بھی ہے۔میرے لیے، اپنے پرانے دوست کی ایک نئی جہت تھی۔بلال نے پندرہ سال پہلے سٹاک کمپنی حاصل کرنے کا واقعہ سنایا کہ کس طرح وہ پوری رات جاگ کر ایک Presentation بناتا رہا۔جو مکمل طور پر غیر روایتی تھی۔بلال کی ذہانت تھی کہ اس نے صرف ایک Presentation کی بنیاد پر سٹاک ایکسچینج میں نشست حاصل کرلی، جسکے لیے لوگ پتہ نہیں کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں۔وہ طلباء اور طالبات کو میڈیکل لائن سے علیحدہ ہوکر ایک کامیاب بزنس مین بننے کی وجوہات بھی بتاتا رہا۔اپنے شاندار کارنامے بھی انتہائی سادگی سے بیان کرتا رہا۔پرانی عادت ہے کہ

ہر مشکل ترین چیز کو سادگی سے بتانے کے فن کو بھرپور طریقے سے جانتا ہے۔

ڈاکٹر نوید نے چند مزید سوال کیے اور پھر طلباء اور طالبات سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلی بات تو یہ کہ کم از کم مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یونیورسٹی کی سطح کے ہمارے بچے کتنے لائق ہیں۔ ان میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی کتنی تڑپ ہے۔ پہلے ایک طالبعلم نے سی ایس ایس کے متعلق پوچھا کہ یہ امتحان کرنا کتنا مشکل ہے۔ میرا جواب تیس سال پرانا تھا۔ یہ امتحان بالکل مشکل نہیں ہے۔ معمولی سا ڈسپلن اور پڑھنے کی منصوبہ بندی آپکو کامیاب کر سکتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ امتحان ذہانت کا نہیں ہے بلکہ اچھی قوت یاداشت کا ہے۔ بہرحال اس نوجوان کو یہ نہ بتا سکا کہ یہ امتحان تو پاس کرنا آسان ہے۔ مگر اسکے بعد ہمارے طاقت کے ایوان میں جس طرح میرٹ کی ناقدری ہے، اسکا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ جتنی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے، اسکو بیان کرنا ناممکن ہے۔ سیاستدان جس طرح ذاتی فائدوں کیلئے احکامات صادر کرتے ہیں، وہ دو عملی بھی ان بچوں کو نہ بتا سکا۔ اس ملک میں کامیابی محنت سے نہیں، بلکہ سازش اور طاقتور گروہ سے منسلک ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ خیر اس نوجوان کو حوصلہ دیا کہ جب چاہو، یہ امتحان آرام سے پاس کر سکتے ہو۔ ایک بچی نے بہت ذہین سوال کیا کہ بیوروکریسی نظام کو تبدیل کرنے میں کیوں ناکام رہی ہے۔ میرا جواب تھا کہ پوری دنیا میں بیوروکریسی "سٹیٹس کو" کی محافظ ہے۔ بڑے سے بڑا بیوروکریٹ بھی ہمارے ادنیٰ نظام میں جوہری تبدیلی نہیں لا سکتا۔ ایک بہت مہیب مشین ہے اور ہر سرکاری ملازم اسکا ایک پرزہ ہے۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ہاں، اگر سرکاری ملازم صحیح طرح کام کرے یا اسکو کام کرنے کا موقعہ دیا جائے، تو وہ عام آدمی کی زندگی میں بے حد آسانیاں پیدا کر سکتا ہے۔ مگر نظام میں بہتر تبدیلی سرکاری ملازم کی استطاعت سے باہر ہے۔ بلکہ اب تو یہ لگتا ہے کہ کسی بھی ملکی ادارے کی طاقت سے باہر ہے۔ بگاڑ اتنا زیادہ ہے کہ کوئی بھی اسے مکمل طور پر اکیلا ٹھیک نہیں کر سکتا۔

اسی طرح ڈاکٹر بلال سے بھی بہت سوال ہوئے کہ انہوں نے جوان عمری میں اتنی ترقی کیسے کر لی۔ کہا ڈاکٹری اور کہاں بین الاقوامی سطح کے ملبوسات۔ بلال اپنے مخصوص سٹائل سے جوابات دیتا رہا بلکہ کمال جواب دیتا رہا۔ تین گھنٹے کیسے گزرے۔ معلوم ہی نہ ہو سکا۔ سوالات کا سلسلہ اتنا دلچسپ تھا کہ وقت گزرنے کا معلوم ہی نہیں ہوا۔ ڈاکٹر نوید کا شکریہ کہ اتنی بھرپور تقریب کا اہتمام کیا۔ ایک احساس واپسی پر ذہن میں مستقل طور پر موجود رہا کہ ہماری نوجوان نسل، میری عمر کے لوگوں سے زیادہ ذہین اور باعلم ہے۔ انکی ذہنی جہتیں ناقابل یقین حد تک بلند ہیں۔ ہمارے ملک کی یہ نوجوان نسل، دراصل اچھے مستقبل کی بھرپور اُمید اور ضامن ہے۔ یہ بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ زمین نہیں بلکہ سیاروں کو مفتوح کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا بوسیدہ نظام انکے خوابوں کی تعبیر دینے کی استطاعت رکھتا ہے؟

راؤ منظر حیات